کام آتی ہے رایگانی بھی

کاشف حسین غائرؔ

رنگِ ادب پبلی کیشنز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کام آتی ہے رایگانی بھی

کاشف حسین غائرؔ

اشاعت: ۲۰۲۳ء

تزئین: حبیب الرحمٰن اعوان

ترتیب وانتخاب: شاہ زیب خان/ حارث حسّان

کمپوزنگ: اکرم کمبوہ

قیمت: ساتھ سو روپے

ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز (کراچی)

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے

رنگِ ادب پبلی کیشنز

آفس نمبر-5 کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

0336-2085325 - 0345-2610434 - 0300-2054154 - 021-32761100

Email: rangeadab@yahoo.com - www.facebook.com/rangeadab

انتساب

حلقہء احباب کے نام

میرے احباب سلامت، مری دُنیا آباد

میرے آگے تھے مال و اسباب چُنے
لیکن میں نے خوشبو سے احباب چُنے

فہرست

عقیدت

☆ بنا ہے آدمی انسان (نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) 10

☆ ہوں دُور ہو کے بھی (نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) 11

☆ مجھ کو حاصل سلام کا حق ہے (سلام) 13

☆ اب تک فرات کی وہ روانی بیاں کرے (سلام) 14

اظہارِ خیال

جدید حسیّت، عصری تغیرات اور کاشف غائر کی غزل فہیم شناس کاظمی 15

غزلیات، اشعار

☆ ۔۔۔کیا روِش ہوگی مرے بعد، اکیلے پن کی؟ 26

☆ ۔۔۔آدمی ہوں دلِ ناکام سے ملتا جُلتا 28

☆ ۔۔۔سبھی کو قیس کی دیوانگی پسند آئی 30

☆ ۔۔۔آخر زوال دستِ ستمگر پہ آ گیا 32

☆ ۔۔۔نیتِ چشمِ تماشائی کہاں اچھی ہے 34

☆ ۔۔۔دیدۂ حیران خالی ہوگیا 36

☆ ۔۔۔جان تک ہار دی دل میں ترے گھر کرنے کو 38

☆ ۔۔۔اب دیکھنا بھی کور نگاہی سے کم نہیں 40

☆ ۔۔۔غبارِ راہ سے دامن بچا کے چلتا ہوں 42

☆ ۔۔۔جب ایک روز مرا خود سے دوستانہ بڑھا 44

☆---شہر میں ایسا قحطِ آب پڑا 46
☆---اِک عمر ہو گئی اِسی منظر میں قید ہے 48
☆---غبارِ رنج والم رہگزر کے ساتھ نہ ہو 50
☆---داناؤں کو بھی عشق کا ہنگامہ لے گیا 52
☆---خواب آنکھوں کو پریشان بہت کرتے ہیں 54
☆---یہ جیون کا خلا بھر سا گیا ہے 56
☆---دل کو محرومِ رُخِ یار نہیں ہونے دیا 58
☆---فقط سفر ہی نہیں، ہمسفر بھی دیکھتے ہیں 60
☆---کیوں نام لیا جائے کسی کا مرے آگے 62
☆---پہلے تقدیر کا نشانہ بنا 64
☆---پوچھتی آئی ہے بہار مرا 66
☆---کچھ روز سے جو گھر میں بھی آرام وہ نہیں 68
☆---مرے لیے وہ پریشان ہو کے آیا ہے 70
☆---خواب ٹھہرا ہُوا جو دیدۂ نمناک میں ہے 72
☆---اب کوئی بھی کسی کے حق میں نہیں 74
☆---یہ دیے آگ لگانے کے لیے رکھے ہیں 76
☆---زمیں پہ میرے زمانے کے ختم ہوتے ہی 78
☆---ہوتے مجھے غرقاب کسی نے نہیں دیکھا 80
☆---دل کے معاملات میں دانائی شرط ہے 81
☆---دُنیا کو دیکھنے سے سوا دیکھنا پڑا 82
☆---ہونے کا یہ گمان ابھی ہے، ابھی نہیں 84
☆---ہمارے سامنے دنیا کا حال رکھا ہے 86
☆---خزاں تو مجھ پہ طاری ہو رہی ہے 88
☆---اک ساعتِ فانی نے مری نیند اُڑا دی 89

☆---کچھ اور بے سروسامانی بڑھ گئی میری 90
☆---دل کہ بازارِ جاں سے اُٹھتا ہے 92
☆---وہ خود سے برسرِ پیکار ہے ہمارے لیے 94
☆---موت کے اِس کھیل میں گر زندگی شامل نہ ہو 96
☆---میرے آگے تھے مال واسباب چُنے 98
☆---دل ہے کہ بہ ضد نجم شماری کے لیے ہے 100
☆---سوال کچھ ہے مرا، کچھ جواب ملتا ہے 102
☆---خوش نظر آتا ہوں خوشی کے بغیر 104
☆---عجلت کے باب میں مجھے تاخیر کیا ہوئی 105
☆---بے گھروں کے واسطے کوئی مکاں خالی نہیں 106
☆---دھوپ میں رختِ سفر ایک دعا کا سایہ 108
☆---راستے خوف وخطر والے ہیں 110
☆---یہ محبت کا چلن عام نہیں تھا پہلے 112
☆---خود آپ اپنی مدح سرائی میں پڑ گیا 114
☆---سر پہ وہ عالمِ افلاک اُٹھا لیتا ہے 116
☆---زمیں کی بات پہ ہم نے تو دھیان تک نہ دیا 117
☆---باہر چمک رہی ہے جو اندر کی دھوپ ہے 118
☆---خشک اب دیدۂ پُرنم نہیں ہونے والا 119
☆---مجھے جو دیکھ نہیں سکتے نام کرتے ہوئے 120
☆---کام ہمارے دیوار ودر آ جاتے ہیں 121
☆---باہر کبھی اندر کی کوئی بات نہیں کی 123
☆---پڑی اس آنکھ کی جب روشنی ستارے پر 125
☆---دریا کی سمت، دل کے اِشارے پہ آ کے ہم 126
☆---شدید حبس ہے اِس شہر میں ہوا کی قسم 127

☆---ٹھہراؤ اِس ندی کا روانی سے کم نہیں 129

☆---کیسے ہو میری اور تری تنہائی ایک سی 131

☆---سمجھا کہاں گیا اُسے مانا کہاں گیا 133

☆---ہوا کی باتوں میں آیا ہُوا پرندہ ہے 135

☆---بزم آرائی کسی اور طرف لے جائے 137

☆---دولتِ آبلہ پائی بھی گئی 139

☆---یہ زخم پیٹھ کا سینے پہ ہونا چاہیے تھا 141

☆---گھر کا مفہوم سمجھ در بہ دری میں آیا 142

☆---یہ معجزہ بھی ہُوا ہے، دُعا کے آخری دن 143

عقیدت

نعت

میں دل کے راستے ہر روز آتا جاتا ہوں
بہت قریب ہے یہ سرزمیں مدینے سے

O

بنا ہے آدمی انسان، آپؐ کے صدقے
سو میرا مال، مری جان، آپؐ کے صدقے

حضورؐ! آپؐ کی باتیں چراغِ راہِ حیات
سمجھ میں آ گیا قرآن آپؐ کے صدقے

حضورؐ! کفر نے کوئی کسر نہیں چھوڑی
بچا ہوا ہے یہ ایمان آپؐ کے صدقے

حضورؐ! آپؐ کے کہنے سے بول اُٹھے کنکر
عقیق و نیلم و مرجان، آپؐ کے صدقے

حضورؐ! مجھ سے گنہگار کی شفاعت کا
کریں گے آپؐ ہی سامان آپؐ کے صدقے

نگاہ کیجیے کاشف حسین غائرؔ پر
کہ معتبر ہوئے حسّان آپؐ کے صدقے

O

ہوں دُور ہو کے بھی اب تک قریں مدینے سے
میں ایک لمحہ بھی غافل نہیں مدینے سے

میں دل کے راستے ہر روز آتا جاتا ہوں
بہت قریب ہے یہ سر زمیں مدینے سے

میں ایک رنج گزیدہ بس اِتنا جانتا ہوں
کوئی خوشی سے پلٹتا نہیں مدینے سے

پھر آفتاب کی حاجت رہی نہ دُنیا کو
طلوع جب ہوا ماہِ مبیں مدینے سے

بس ایک روز مدینے کو جاؤں پھر غائرؔ
تمام عمر نہ جاؤں کہیں مدینے سے

سلام

تفسیر اِس کے اسم کی لفظوں سے ماورا
کیسے کوئی "حسینؓ" کے معنی بیاں کرے

O

مجھ کو حاصل سلام کا حق ہے
کہ یہ اُن کے غلام کا حق ہے

حق ادا کر گئے امام حسینؑ
وہ جو سجدے قیام کا حق ہے

کیوں نہ کہلائیں وارثِ کوثر
آپؑ سے تشنہ کام کا حق ہے

کیوں کہوں آپ صرف میرے ہیں
آپؑ پر تو تمام کا حق ہے

مجلسِ شامِ غم ہے اور ہم ہیں
آنسوؤں کو کلام کا حق ہے

کہتا ہے، آفتابِ عاشورہ
آج کے دن پہ شام کا حق ہے

کاش، کاشفؔ حسین ادا ہو جائے
مجھ پہ جو میرے نام کا حق ہے

O

اب تک فرات کی وہ روانی بیاں کرے
پیاسوں کی داستان کو پانی بیاں کرے

تفسیر اِس کے اسم کی لفظوں سے ماورا
کیسے کوئی "حسینؑ" کے معنی بیاں کرے

طیبہ سے کربلا کی طرف جاتی یہ سڑک
جیسے وہ رنجِ نقلِ مکانی بیاں کرے

ہوتے نہیں بیان مصائب زبان سے
یہ دُکھ ہماری اشک فشانی بیاں کرے

باطل کہے کہ حق کی نشانی حسینؑ ہیں
کیا اِس سے بڑھ کے کوئی نشانی بیاں کرے

غائرؔ ہر ایک بار میں روؤں اسی طرح
جب کوئی داستاں یہ پرانی بیاں کرے

جدید حسیّت، عصری تغیرات اور کاشف غائرؔ کی غزل

کاشف حسین غائرؔ کی شاعری پر بات کرنا اب اتنا آسان نہیں رہا جتنا کہ گزرے دنوں میں تھا، جس کی شاعری پر اوّلین سطح پر دنیائے اردو ادب کے معروف ناقد شمس الرحمن فاروقی اور شمیم حنفی کی حیرت انگیز رائے موجود ہو۔ جس کی غزل کو اردو ادب کی نابغۂ روزگار شخصیت محمد سلیم الرحمن نے اعتبار کی سند دے رکھی ہو، اس کی شاعری پر میری رائے پرِ کاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کا ادراک ہے۔ لیکن چونکہ کاشف سے میرا تعلق بہت قدیم ہے، یعنی نواب شاہ سے، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی شاعری کے خدوخال میرے سامنے سنورے اور نکھرے اور اس میں اس کی ریاضت اور مشقت بلاشبہ بہت زیادہ ہے کہ اس نے چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن کی۔ یوں زندگی سے اس کا براہِ راست تعلق رہا اور وہ 'صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا' سے بخوبی واقف ہے اور اس نے اسی کارِ نامختتم میں جوئے شیر کی تخلیق کا کمال حاصل کر لیا۔ وہ نواب شاہ سے کراچی منتقل ہوا تو گویا اُس کی شاعری کو پر لگ گئے۔ رسا چغتائی کی قربت اور شفقت نے اس کے جوہر مزید جلا بخشی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے صرف شاعری ہی سے اپنی شناخت بنانا ہے، پھر اس نے ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے اپنی ساری توجہ شاعری پر مرکوز کر دی، اور ایک طرح کڑی مشقت کے شب و روز کو، اپنی ظاہری حالت کو بھول کر اپنی اندرونی کائنات میں کھو گیا۔ یہ خود کو کھونا، خود کو پانے کے برابر تھا، اپنے اثبات کی نفی کے جیسا تھا۔ اس کے شعر کراچی کے ادبی حلقوں میں سفر کرنے لگے۔ مگر وہ اپنے شب و روز کی بہتری کے معاملات میں کھویا رہا۔ میں ایک گواہ

کے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ کاشف نے ایک بہت تکلیف دہ اور مشکل زندگی کا سفر اپنی شاعری کے ذریعے آسان کیا ہے۔ اس کی وجہ جناب صابر وسیم اور رفیق احمد نقش اور سب رنگ کا دفتر ہے۔ وہ پہلے بھی اپنے باہر کم دستیاب تھا اب اس کا ملنا اور مشکل ہو گیا۔ وہ خاموشی کی آواز سنتا ہوا در و دیوار کو اور اپنے خوابوں کو مٹی ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ ارض و سما کی سرگوشیاں سنتا ہوا، راستوں پر بھٹکتا رہا۔ پھر راستوں نے اس کے قدم پکڑ لیے اور اُسے کہنا پڑا، راستے گھر نہیں جانے دیتے۔ در و دیوار مٹی کیا ہوئے اس پر وسیع و عریض کائنات کے در کھل گئے۔ اس کے وجودی تجربات اور باطنی مشاہدات ہمہ رنگ سادگی کے ساتھ شاعری میں نمودار ہونے لگے۔

''کام آتی ہے رائیگانی بھی'' اسی کاشف کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے اس کے تین مجموعے ''راستے گھر نہیں جانے دیتے''، ''کہاں جائے گی تنہائی ہماری'' اور ''آسماں آنکھ اٹھانے سے کھلا'' شائع ہو چکے ہیں۔

تازہ مجموعے میں کاشف کی غزل اپنی شاعری کے گزشتہ اسلوب سے گریز کرتی ہوئی اور احساسات و خیالات کے دائرے کو وسیع کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہیں کہ گزشتہ ایک دو سال میں ساری دنیا جس عذاب اور جن ہلاکت و فلاکت کے حالات سے گزری ہے اس کے اثرات بہت دلدوز اور دور رس ہیں جنھیں ساری دنیا، خصوصاً ہم جیسے لاقانونیت کا شکار معاشرے بہت زیادہ بھگت رہے ہیں اور حالات کی ہیبت اور خوف ناکی نے انسان کی عزت وقار کے ساتھ بود و نمود کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ ایسے میں ایک حسّاس شاعر اور بے وقار معاشرے کے فرد کی کیا حالت ہو سکتی ہے؟ اس کا اظہار ''کام آتی ہے رائیگانی بھی''، میں کاشف حسین نے بنظر غائر کیا ہے۔ ابتدائی شاعری میں اس کی توجہ داخلی کیفیات، انفرادی ترجیحات، باطنی احساسات اور اسلوب کی انفرادیت تک محدود تھی، جن میں کہیں کہیں نفسیات اور جذباتی رجحانات کی جھلک بھی ہوتی تھی۔ مگر اس مجموعے کا شاعر کاشف حسین کوئی اور ہے۔ یہ وہ کاشف نہیں جو ایک خاص فضا میں رہتا تھا۔ یہ وہ کاشف ہے جو ایشیا کے ایک بڑے شہر کا باسی ہے جو شہری زندگی کی بیگانگی، لاتعلقی اور مشینی معاشرے کے ستم سہتا ہے جو وسیع ترین اور شب و روز تغیرات کی زد میں آئی ہوئی کائنات

میں رہتا ہے۔ یہ وہ ہے جس کی شاعری کے فکری اور شعوری احساسات بین الاجتماعی ہیں یہ اور بات کہ

ہمیں تو یاد وہ کاشف حسین آتا ہے

وہ اب بھی گزشتہ کی طرح بہت پُرسکون نظر آتا ہے مگر اس کے اندر بہت سے طوفان اس کی فکر اور شعور میں برپا رہتے ہیں۔ اس کے ظاہری و باطنی، عرفانی و وجدانی عالم کے تغیرات کا بھونچال اس کی شاعری میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے۔ جمود فکری اور وجودی سطح پر موت ہے اور کاشف کا نیا مجموعہ اس کی نئی زندگی کا عہد نامہ ہے۔

جدید اردو غزل کا آغاز غالبؔ کے بعد فراقؔ اور پھر شکیبؔ جلالی سے ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری اردو غزل کا واحد بالغ نظر نقاد ہے جس کی تنقید مشرقی رنگ و بو اور اپنی ادبی اور فکری فضا میں پروان چڑھی ہے۔ فراقؔ نے جس طرح غزل کی معنویت اور تہہ داری کو نمایاں کیا ہے اس کی مثال اردو کے کسی نقاد کے ہاں نہیں ملتی، اور فراق کی رائے اس مقام پر اس لیے ضروری ہے کہ۔۔۔ کاشف کی غزل سات یا حد سے زیادہ نو شعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ غزل کی بحر، زمین، قافیہ ردیف، مطلع اور مقطع۔ ہر ایک کے بارے میں بہت محتاط اور خلاقانہ ہنرمندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فراق گورکھپوری فرماتے ہیں کہ

’’غزل بہت دِق کرنے والی چیز ہے۔ اس سے سہل اور مشکل کوئی صنف نہیں۔ غزل سات، نو، گیارہ شعر پر ختم ہوئی۔ بہت لوگوں نے غزل کی ’طرح‘ کے لغوی معنی پر غور نہیں کیا۔ طرح کے معنی ہے نمونہ یعنی Model یا Patteren ہیں۔ (جو اس کے مطلع سے آغاز ہوتا ہے) مختلف بحروں میں الفاظ کے بلیغ ارتعاشات بدل جاتے ہیں۔ ایک مقررہ تعداد پر اشعار ختم ہوتے ہیں۔ ہر فنی عمل (art ofWork) کا حجم فن کار کے وجدان اور اس کی قوتِ ممیزہ (Artistic diseretion) کی چیز ہے۔

قافیہ میں آواز کی یکسانیت، وحدت و کثرت، تنوع و ہم آہنگی، تکرار و تجدید اس لطیف رابطے سے متعلق ہے جو ایک نمونے کی خصوصیت ہوتی ہے جس سے غزل کی تشکیل میں یک رنگی پیدا ہوتی ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بحر، زمین مطلع مقطع، قافیہ اور ردیف یہ سب غزل کے سانچے کے نہایت دھندلے عکس کے نشانات ہیں۔ اسی میں فن کے داخلی اور

خارجی اجزا کے نازک ربط کا راز مضمر ہے۔ یہیں سے نقالی اور خلاقی کا پتا چل جاتا ہے، یہیں سے شعر کے فرسودہ و رسمی یا ایک زندہ فنی تخلیق (A living work of ART) ہونے کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس پر شعریت ایک ماورائے لفظ و بیاں اور ماورائے مفہوم چیز ہے۔ جمالیاتی روح یا جوہر (Aesthetic content) شعر کا بعد رابع (Fourth dimension) ہے جو انتہائی سادہ اور پیچیدہ چیز ہے۔‘‘ (۱)

گو حوالہ طویل ہے مگر کاشف کی غزل کی فضا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ کاشف مطلع سے مقطع تک، زمین سے بحر تک، اپنی خلاقانہ ہنرمندی کے ساتھ اپنے ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ غزل کا ردھم، ردیف کی انفرادیت، مطلع اور مقطع کا اہتمام خصوصی طور پر اس کی غزل کا خاصہ ہے اور اس پر اسلوب کی انفرادیت اس کی غزل کو انفرادیت کی سند عطا کرتی ہے۔ یہ سند حاصل ہونا اپنی جگہ کمال سہی مگر اس سے بڑھ کر کمال یہ ہے کہ وہ خاص اسلوب کا حامل ہوتے ہوئے فصاحت و بلاغت کے جوہر سے لبریز ہو۔ اس میں عام سی زندگی کی جھلک خاص بن کر نمودار ہو اور ایسے کہ حیرت زدہ کر دے اور شعری فکر اتنی سیال اور متحرک ہو کہ ایک تصویر دوسرے کئی متحرک منظروں کی عکاسی کرے۔ اتنی سیمابی کہ فکر و شعور میں ہیجان و اضطراب پیدا ہو جائے۔ پہلے مجموعے کے برعکس اس مجموعے میں کاشف کی غزل کی وسعت اور مضامین کی بلاغت عصری غزل کے موجودہ منظرنامے میں ارتعاش پیدا کرنے کا باعث ہے۔ یہ کاشف کی غزل میں خصوصی ریاضت، معنی کی تہہ داری، مصرع سازی اور خیال آفرینی کا سفر ہے۔ یہ شاعری مکمل سہل ممتنع اور سادہ بیانی کے دامن میں وسیع فکری جہات لیے ہوئے ہے، اسے پڑھ کر بے ساختہ محبوب خزاں کا شعر یاد آتا ہے:

جو کھیل جانتے ہیں ان کے اور ہیں انداز
بڑے سکون، بڑی سادگی سے کھیلتے ہیں

اور اس سکون کی تہہ میں بھونچال اور سادگی کے پردے میں سحر انگیز طرحداری جھلکتی ہے۔ کاشف ایسا ہنرمند اور تخلیقی وفور سے لبریز شاعر ہے جو اپنا سارا دکھ چاہے وہ سماجی ہو یا نفسیاتی کو غزل کے پیرائے میں نہایت لطافت، سادگی اور پوری کیفیت کے ساتھ ایک ادائے گریز و لاتعلقی کے ساتھ بیان کرنا خوب جانتا ہے جس میں وہ خود ہو، مگر نہ ہو۔ اُس کی

غزل کا ہر لفظ بامعنی اور اس کی تہہ داری میں اضافہ کرتا ہے۔ کاشف کی غزل کا بہت نمایاں وصف اس کی شعریت سے بھرپور بلاغت اور قافیے کے ساتھ ردیف کا باہم آمیخت ہونا ہے، جس سے پوری غزل ایک اندرونی ربط اور ارتعاش کے ساتھ ایک ایسی عرفانی اور وجدانی زمزمہ پرداز کیفیت تخلیق کرتی ہے کہ فکر تحت الشعر امکان در امکان معانی کے رہ داریاں کھولتی چلی جائے جن کی انتہا پر اک اور حیرت ہماری منتظر ہو۔ جیسے

عجب نہیں کہ کسی روز یہ بھی اُڑ جائے
جو کینوس پہ بنایا ہوا پرندہ ہے

خرید لیتا مگر میرے پاس وقت نہ تھا
روا روی میں مجھے وہ گھڑی پسند آئی

آپ سمجھیں گے اِسے صرف اکیلا ہو کر
کیونکہ دُنیا ہے یہ ایجاد اکیلے پن کی

اِن دنوں کوچہ و بازار میں سنّاٹا ہے
اور سنّاٹا بھی کہرام سے ملتا جُلتا

گرانیِ حالات کی زد میں رہنے کے باوجود شعر کے معاملے میں سوتے ہوئے بھی اس کی تمام تر حسیات بیدار اور چوکنا رہتی ہیں۔ اس کی مصرعہ سازی تمثال دار اور ایسی منفرد ہوتی ہے کہ بے اختیار داد دی جائے کہ اس سے موزوں مصرعہ اور شعر ہونا ممکن نہیں تھا۔ ۔ وہ سب کا دوست ہے مگر اپنی شاعری کا دشمن۔ اس کی جتنی شاعری اشاعت و طباعت کے مراحل سے گزری ہے تقریباً اتنی ہی اس نے قلمزد بھی کی ہے۔ دس بیس شعر کہہ کر چھ نو شعر رکھنا ایک مشکل مرحلہ ہے مگر کاشف ان مراحل سے بار بار گزرنا پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ سحر انگیز المناکی اور جمالیاتی سرشاری میں ڈوبی اداسی بہت دلکشی کے ساتھ اس کی غزل کو سنوارتی ہے۔

جنگل کے راز ان کے سِوا جانتا ہے کون
سانپوں سے پوچھیے کہ خزانہ کہاں گیا؟

قیمتی اشیا سے گھر تو بھر گئے
ہاں مگر انسان خالی ہو گیا

اس رستے میں شرط ہے چلتے ہی رہنا کیا؟
رُکنے کا سوچوں تو چکّر آ جاتے ہیں

مجھ ایسے تنگ دست سے اُس نے کیا سوال
تو ہنس پڑا میں، پیار گداگر پہ آ گیا

مندرجہ بالا اشعار میں سماجی، سیاسی، اجتماعی اور ذاتی عصری المناکی جس خوب صورتی سے بیان کی گئی ہے اس کی پہلی مثال ہمیں شکیب جلالی کی غزل سے اردو شاعر میں نظر آتی ہے۔ کاشف نے شکیب کی طرح جدید حسیت اور عصری شعور کی ملی جلی رو سے اپنی غزل کو ندرت وجدت اور موضوعاتی تنوع سے ہم کنار کیا ہے۔ شکیب نے کہا تھا کہ

میں نے اسے شریکِ سفر کر لیا شکیبؔ
اپنی طرح سے چاند جو بے گھر لگا مجھے

یا

ہر چند راکھ کے ہو کے بکھرنا ہے راہ میں
جلتے ہوئے پروں سے اڑا ہوں مجھے بھی دیکھ

شکیب کی طرح کاشف کی غزل میں طلسماتی اداسی کی فضا بے حد سادہ مگر معنوی تہ داری اور طرح داری سے آراستہ ہے۔ داخلی اور خارجی قلق اور لطیف ترین پُراسراریت اور سحر انگیزی کی صفات کو زینت بنائے آہستہ سے طبعِ لطیف پر اُترتی ہے اس کی ایمائیت و رمزیت میں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے۔ اگر اس میں جدت و ندرت ہو تو اس کی کیفیت لامحدود

نامعلوم اسرار و رموز کے در وا کر دیتی ہے جہاں حیرت و صداقت کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

کیا ہُوا میرے گناہوں کا حساب
حشر کا میدان خالی ہو گیا

اس سر زمینِ دل پہ حکومت عدو کی ہے
یہ رنج مجھ کو نقل مکانی سے کم نہیں

یہ گردشیں مرے چلنے سے خوف کھاتی ہیں
چلوں تو کام میں اِن کا بڑھا کے چلتا ہوں

نہ جانے پوچھ لے کیا ہم سے ممتحن غائرؔ
اِس ایک ڈر سے کبھی امتحان تک نہ دیا

رایگانی کے سِوا ملتا نہیں ہے کچھ یہاں
پھر بھی اِس بازار میں کوئی دُکاں خالی نہیں

یہ اور اس جیسے لاتعداد شعر اس مجموعے کے ہر ورق پر دامن گیر ہوتے ہیں اور کاشف کی غزل سے وہ قاری صحیح معنیٰ میں لطف اندوز ہو سکتا ہے جو اردو غزل کی روایت سے مکمل آگاہ ہو۔

کاشف کی غزل میں عصر حاضر کی سنگینی، جدید تر نفسیاتی توجیہات، سیاسی و سماجی ترجیحات اور اس منظر نامے میں انسان کی بے حیثیتی اور بے وقعتی کا ادراک، شعوری اور لاشعوری طور پر تخلیقی شعریت اور فکری آزادی و تہہ داری کے ساتھ ان لفظوں کے باطن سے قلب انسان تک اپنے ارتعاش پوری شدت کے ساتھ منتقل کرتا ہے۔

حاکمِ وقت کی جانب سے پذیرائی بھی
ایک اعزاز ہے الزام سے ملتا جُلتا

جس کو اسلام کے دھوکے میں ہوا اپنائے ہوئے
کوئی مذہب ہے وہ اسلام سے ملتا جُلتا

آخر زوالِ دستِ ستمگر پہ آ گیا
جو زخم دل پہ آنا تھا، خنجر پہ آ گیا

چائے خانوں میں، مکانوں میں، بیابانوں میں
دیکھتا رہتا ہوں تنہائی کہاں اچھی ہے

دیدۂ حیران خالی ہو گیا
آج یہ زندان خالی ہو گیا

بنیاد رکھنے والے کو معلوم ہی نہ تھا
تعمیر اِس مکاں کی تباہی سے کم نہیں

کیسے ہو میری اور تری تنہائی ایک سی
بکھراؤ ایک سا ہے، نہ یکجائی ایک سی

یہ فرق دیکھنے کا نہیں، سوچنے کا ہے
ورنہ ہے میری آپ کی بینائی ایک سی

یہ زخم پیٹھ کا سینے پہ ہونا چاہیے تھا
تو فخر آپ کو جینے پہ ہونا چاہیے تھا

ہوش مندوں کو کہاں دل سے علاقہ غائرؔ
جو بھی آیا ہے یہاں بے خبری میں آیا

میری تعمیر کے اب عیب نہ گنوائیں مجھے
آپ نے ٹھیک سے مسمار نہیں ہونے دیا

غائرؔ اندھا بھی کوئی کیا ہوگا
جتنے اندھے یہ نظر والے ہیں

یوں تو ناکام ہوں، مگر غائرؔ
کام میں بیش تر کے آتا ہوں

لوگوں کا شب کو جاگتے رہنا یونہی نہیں
یہ شہرِ بے فصیل، کسی ڈر میں قید ہے

زندگی سے ہے اختلاف بہت
میں مگر خودکشی کے حق میں نہیں

ممکن ہے ایک روز اِسے بھی میں چھوڑ دوں
جو کام کر رہا ہوں میں ،یہ کام وہ نہیں

جوش بیان، سادگی، خیال کی شدت اور ندرت، جمالیاتی رس میں ڈوبا اسلوب سیال اور متحرک امیجری کاشف کی غزل کو اعلیٰ وارفع فکری شاعری کی رو سے متصل کر دیتی ہے۔ اور جدید تر حسیت اور باز آفرینی علامتی و معنوی طور پر اپنے مختلف اور منفرد ہونے اور

سحر انگیزی سے فکر و عرفان کو مسحور کرتی ہے۔

کاشف بنظرِ غائر روحانی، وجدانی و عرفانی سطح پر کھلے ذہن و دل کے ساتھ زندگی کی تضادات وتغیرات، وقوعات و حالات کا تجزیہ اور مشاہدہ کرتا ہے اور اسے اپنی شاعری میں شعر کی اکائی میں خیال کی گہرائی اور وسیع امکانات کے ساتھ، فصاحت و بلاغت کے ساتھ رقم کرتا ہے۔ میرؔ کی سادگی، آتشؔ کی سی مرصع سازی لیے اس حبس زدہ بحرانی دور میں جب سعادت یار خان رنگیں کی ریختی طرز کی پست معاملات محاکات بعید کی مشاعراتی شاعری عام ہو رہی ہے کاشف کی غزل جدید اردو غزل میں خوشگوار موسم کی آمد کا اشارہ ہے۔

دعا ہے کہ اس کی فکری شادابی قائم و دائم رہے۔

ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی
دو ستمبر دو ہزار تئیس

(ا) حوالہ: فراق گورکھپوری - اردو غزل گوئی - ادارہ فروغ اردو لاہور، 1955-

غزلیات، اشعار

یعنی اچھا ہے رایگاں ہونا
کام آتی ہے رایگانی بھی

O

کیا روِش ہو گی مرے بعد، اکیلے پن کی؟
میں نے رکھی تو ہے بُنیاد اکیلے پن کی

آپ سمجھیں گے اِسے صرف اکیلا ہو کر
کیونکہ دُنیا ہے یہ ایجاد اکیلے پن کی

تختۂ دار پہ اب تیرے سِوا کوئی نہیں
اب سزا کاٹ تُو جلّاد اکیلے پن کی

گھومتا رہتا ہے وہ شخص جو محفل محفل
پوچھتا پھرتا ہے میعاد اکیلے پن کی

اب پریشان ہے وہ مجھ کو اکیلا کرکے
آ پڑی اُس پہ بھی اُفتاد اکیلے پن کی

ایک اک کرکے کئی لوگ مجھے یاد آئے
لکھنے بیٹھا جو میں رُوداد اکیلے پن کی

عین ممکن ہے کہ تجھ کو بھی اکیلا کردے
یہ کہانی ہے جہاں زاد اکیلے پن کی

میں اکیلا ہی رہا شہر میں ہوتے ہوئے بھی
داد دو مجنوں و فرہاد اکیلے پن کی!

میرے اعزاز میں اک بزم سجا کر غائرؔ
لوگ دیتے ہیں مجھے داد اکیلے پن کی

O

آدمی ہوں دلِ ناکام سے ملتا جُلتا
میرا آغاز ہے انجام سے ملتا جُلتا

اِن دنوں کوچہ و بازار میں سنّاٹا ہے
اور سنّاٹا بھی کہرام سے ملتا جُلتا

حاکمِ وقت کی جانب سے پذیرائی بھی
ایک اعزاز ہے الزام سے ملتا جُلتا

جس کو اسلام کے دھوکے میں ہوا اپنائے ہوئے
کوئی مذہب ہے وہ اسلام سے ملتا جُلتا

بے نیازی کسے کہتے ہیں اُسے کیا معلوم
وہ جو ہر شخص سے ہے کام سے ملتا جُلتا

دیکھنے والوں کو بیکار نظر آتے ہیں ہم
کیا عجب کام ہے، آرام سے ملتا جُلتا

کیا مری بات کا مفہوم سمجھ میں آئے
کہ یہ ابلاغ ہے ابہام سے ملتا جُلتا

صبح سے جو مرے اعصاب پہ چھایا ہوا ہے
کوئی منظر ہے اُسی شام سے ملتا جُلتا

گھر کے دھوکے میں کئی روز گزارے غائرؔ
کیا کھنڈر تھا وہ در و بام سے ملتا جُلتا

O

سبھی کو قیس کی دیوانگی پسند آئی
مجھے تو دشت کی دریا دلی پسند آئی

خرید لیتا مگر میرے پاس وقت نہ تھا
روا روی میں مجھے وہ گھڑی پسند آئی

یہ دل جو ڈوب رہا تھا قریبِ شام، اِسے
غروب ہوتی ہوئی روشنی پسند آئی

مرے یہ اشک تمھیں ناپسند ہوں تو ہوں
مگر مجھے تو تمھاری ہنسی پسند آئی

مرا ہی تذکرہ ہر ایک کی زبان پہ تھا
تمھاری بزم میں اپنی کمی پسند آئی

جہاں مگن تھے سبھی لوگ شور کرنے میں
وہاں کسی کی مجھے خامشی پسند آئی

ذرا پسند نہیں تھا طلسمِ آتش و آب
مگر یہ خاک کی جادوگری پسند آئی

تمام کام کی چیزیں تھیں ناپسند مجھے
وہ ایک چیز جو بیکار تھی، پسند آئی

ٹھہرنے والوں کے ہیں مسئلے جُدا غائرؔ
گزرنے والوں کو تو یہ گلی پسند آئی

O

آخر زوال دستِ ستمگر پہ آگیا
جو زخم دل پہ آنا تھا، خنجر پہ آگیا

پیاسے کا ڈوبنا بھی کہانی سے کم نہیں
الزام خودکشی کا سمندر پہ آ گیا

لکھا گیا ہے اِس کے مقدّر میں ٹوٹنا
یونہی نہیں یہ دل کسی پتھر پہ آ گیا

میں حادثے کو جب نظر آیا نہ راہ میں
میری مزاج پُرسی کو وہ گھر پہ آ گیا

مجھ ایسے تنگ دست سے اُس نے کِیا سوال
تو ہنس پڑا میں، پیار گداگر پہ آ گیا

دیوانگی میں مجھ کو پتا ہی نہیں چلا
یہ دل کا بوجھ کیسے مرے سر پہ آ گیا

غائرؔ یہ آسمان و زمیں گھومنے کے بعد
جس در سے میں اُٹھا تھا، اُسی در پہ آ گیا

☆

کب سے میں تیری طرح خاموش ہوں
خامشی اب تو سنائی دے مجھے

O

نیتِ چشمِ تماشائی کہاں اچھی ہے
یعنی سب کے لیے بینائی کہاں اچھی ہے

چائے خانوں میں، مکانوں میں، بیابانوں میں
دیکھتا رہتا ہوں تنہائی کہاں اچھی ہے

دیکھنے والے ہی کا حسنِ نظر تھا، ورنہ
اچھی دنیا جو نظر آئی، کہاں اچھی ہے

روٹھ سکتی ہے خوشی تم سے ہمیشہ کے لیے
غم کی اتنی بھی پذیرائی کہاں اچھی ہے

پھر سے میں ڈھونگ رچا لیتا ہوں نادانی کا
یوں بھی اِس کھیل میں دانائی کہاں اچھی ہے

روکتے رہ گئے سب، بزم سے میں اُٹھ آیا
مجھ کو معلوم تھا تنہائی کہاں اچھی ہے!

بوجھ بن جائے نہ یہ کارِ مراسم غائرؔ
شہر میں اِتنی شناسائی کہاں اچھی ہے

☆

اِس طرح تو نہ یہ آئینے مجھے ٹھکرائیں
دیر لگتی نہیں، پتھر کو خدا بننے میں

O

دیدۂ حیران خالی ہو گیا
آج یہ زندان خالی ہو گیا

دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہرِ خواب
نیند کے دوران خالی ہو گیا

قیمتی اشیا سے گھر تو بھر گئے
ہاں مگر انسان خالی ہو گیا

تتلیوں کے ساتھ گل بھی اُڑ گئے
ایک دن گلدان خالی ہو گیا

اُڑ رہی ہے ہر طرف خوابوں کی راکھ
جیسے آتش دان خالی ہو گیا

کیا ہُوا میرے گناہوں کا حساب
حشر کا میدان خالی ہو گیا

گھر سے وہ مہمان کیا رخصت ہُوا
میرا دستر خوان خالی ہو گیا

ساری مردہ خواہشیں زندہ ہوئیں
دل کا قبرستان خالی ہو گیا

دُکھ یہی ہے شہر یہ کاشفؔ حسین
ہوتے ہی گُنجان، خالی ہوگیا!

O

جان تک ہار دی دل میں ترے گھر کرنے کو
اور کیا کیجیے یہ معرکہ سر کرنے کو

وہ سرِ راہ گزر ملتے نہیں ہیں، ورنہ
کتنی باتیں ہیں سرِ راہ گزر کرنے کو

روز اک خوف کے نزدیک چلا جاتا ہوں
دُور اِس دل سے فقط موت کا ڈر کرنے کو

مجھ سے وحشی کو مگر اِس کی اجازت ہی نہیں
میں تو تیار ہوں اس دشت میں گھر کرنے کو

اب کوئی اور نہ الزام لگائیں مجھ پر
عشق کافی ہے مجھے شہر بدر کرنے کو

ایسا منظر ہے کوئی آنکھ ہٹاتا ہی نہیں
میں نے جس سے بھی کہا ایک نظر کرنے کو

اِس طرح لوگ یہاں عمر بسر کرتے ہیں
جس طرح عمر ہو یہ صرف بسر کرنے کو

سوچتا ہوں کہ کسی روز اُدھر جا نکلوں
ویسے بھی کام نہیں کوئی اِدھر کرنے کو

آنا جانا لگا رہتا ہے اُدھر بھی غائرؔ
یاد کی ریل ہے ماضی میں سفر کرنے کو

O

اب دیکھنا بھی کور نگاہی سے کم نہیں
یہ کیسی روشنی ہے سیاہی سے کم نہیں

بنیاد رکھنے والے کو معلوم ہی نہ تھا
تعمیر اِس مکاں کی تباہی سے کم نہیں

مجنوں نے اس کو یونہی نہیں زیب تن کِیا
صحرا کی خاک خلعتِ شاہی سے کم نہیں

اِس شہر میں ہیں منصف و قاتل ملے ہوئے
یہ سرزنش بھی پُشت پناہی سے کم نہیں

ہر ایک معرکے میں مرے ساتھ ہے
یعنی کہ میرا سایہ سپاہی سے کم نہیں

یہ بولنے کا وقت ہے اور تیری خامشی
میرے خلاف تیری گواہی سے کم نہیں

☆

میرے پیروں سے زمیں جانے لگی
ناؤ جب اور کہیں جانے لگی

O

غبارِ راہ سے دامن بچا کے چلتا ہوں
میں ساتھ ساتھ اگرچہ ہوا کے چلتا ہوں

یہ بارِ ہجر کہاں سر اُٹھانے دیتا ہے
سو ایک عمر سے میں سر جھکا کے چلتا ہوں

زمیں پہ نقش بنانا مجھے پسند نہیں
میں اپنے نقشِ قدم تک مٹا کے چلتا ہوں

یہ گردشیں مرے چلنے سے خوف کھاتی ہیں
چلوں تو کام میں اِن کا بڑھا کے چلتا ہوں

بساطِ دہر پہ میرا حریف روتا ہے
میں جب بھی چال کوئی مسکرا کے چلتا ہوں

گزرنے والے بہ آسانی دیکھ لیں مجھ کو
میں اِتنی خاک زمیں پر اُڑا کے چلتا ہوں

یہ میرا راستہ آسان تو نہیں، غائرؔ
بُرا ہی کیا ہے اگر ڈگمگا کے چلتا ہوں

☆

لازمی ہے مخالفت میری
میں بھی آخر کتاب لایا ہوں

O

جب ایک روز مرا خود سے دوستانہ بڑھا
تو میں نے دیکھا مری سمت اک زمانہ بڑھا

عجیب جنگ تھی وہ بھی کہ میں شکست کے بعد
تمھاری سمت بڑھا اور فاتحانہ بڑھا

جہان بھر کی محبت یونہی کمائی نہیں
کہ میں نے خرچ کِیا ہے تو یہ خزانہ بڑھا

دلِ شکستہ تری عافیت اِسی میں ہے
کہ جس سے ربط بڑھانا ہو غائبانہ بڑھا

پرندگاں کی طرح زندگی گزار، میاں!
کبھی نہ دل میں تمنائے آب و دانہ بڑھا

بالآخر اس کو گلے سے لگا لیا میں نے
غمِ جہاں جو مری سمت والہانہ بڑھا

تو ویسے ویسے ہی کردار کم ہوئے غائرؔ
کہ جیسے جیسے مری عمر کا فسانہ بڑھا

☆

زمیں پہ آنے سے پہلے کی بات ہے غائرؔ
زمیں کو دیکھتا رہتا تھا آسمان سے میں

O

شہر میں ایسا قحطِ آب پڑا
دیکھتا رہ گیا سراب پڑا

نیکی کیجے تو لوگ پوچھتے ہیں
تم کو کتنے میں یہ ثواب پڑا؟

سطح پر آ گیا خزانے کے ساتھ
وہ جو فتنہ تھا زیرِ آب پڑا

اُس نے بخشا ہے بے حساب مجھے
تا کہ کرتا رہوں حساب پڑا

صبح ہوتے ہی میں تو اُٹھ بیٹھا
سو رہا ہے مگر وہ خواب پڑا

تم نے ہونٹوں سے چھُو لیا جس کو
نام اُس پھول کا گلاب پڑا

کیا وہ خانہ خراب دل میں نہیں؟
خانۂ دل جو ہے خراب پڑا

کام، ناکام کا ہی عشق میں ہے
ہاتھ ملتا ہے کامیاب پڑا

وقت نے وہ سبق دیا غائرؔ
اک طرف رہ گیا نصاب پڑا

O

اِک عمر ہوگئی اِسی منظر میں قید ہے
یہ آدمی قفس میں نہیں، گھر میں قید ہے

گھیرا ہُوا ہے دل کو عجب حادثات نے
کچھ دن سے یہ جہاز سمندر میں قید ہے

ناکام ہو کے رہ گئی کوشش فرار کی
نکلے وہ کس طرح کہ مقدر میں قید ہے

خوش ہوں کہ میں اکیلا نہیں قید خانے میں
قیدی اک اور میرے برابر میں قید ہے

اُس روشنی کی کوئی ضرورت نہیں مجھے
وہ روشنی کہ جو مہ و اختر میں قید ہے

لوگوں کا شب کو جاگتے رہنا یونہی نہیں
یہ شہرِ بے فصیل، کسی در میں قید ہے

کانوں میں گونجتی ہے اک آواز اور بھی
میرے سِوا بھی کیا کوئی پتھر میں قید ہے

اے کاش اپنی قید سے آزاد ہو سکوں
خواہش عجیب سی دلِ خودسر میں قید ہے

پروانۂ رہائی ہے غائرؔ یہ وقتِ شام
لیکن وہ کیا کرے کہ جو دفتر میں قید ہے

O

غبارِ رنج و الم رہگزر کے ساتھ نہ ہو
جو دل کے ساتھ ہُوا ہے، نظر کے ساتھ نہ ہو

وگرنہ چھاؤں کی حُرمت پہ حرف آئے گا
کہیں بھی دھوپ ہو لیکن شجر کے ساتھ نہ ہو

یہ حکم بھی اسی صیّاد کی طرف سے ہے
پرندہ قید میں بھی بال و پر کے ساتھ نہ ہو

ہمارے لوگ اسے مسئلہ سمجھتے ہیں
وہ مسئلہ جو یہاں بیش تر کے ساتھ نہ ہو

جسے یہ لوگ کھنڈر میں تلاش کرتے ہیں
دبا ہُوا وہ خزانہ کھنڈر کے ساتھ نہ ہو

خیال رکھنا کنارے پہ پاؤں دھرتے ہوئے
ملا ہُوا یہ کنارہ بھنور کے ساتھ نہ ہو

پھر اپنی شام بھی غائرؔ بُری گزرتی ہے
شروع دن اگر اچھی خبر کے ساتھ نہ ہو

☆

یہ کیا کہ صرف ہمارے چراغ رکھے جائیں
ہوا کے سامنے سارے چراغ رکھے جائیں

O

داناؤں کو بھی عشق کا ہنگامہ لے گیا
کس کس کو اپنے ساتھ یہ علّامہ لے گیا

اُس نامہ بر کو آج تو عُجلت عجیب تھی
دو لفظ رہ گئے تھے کہ وہ نامہ لے گیا

سب گھاٹیوں کو سر کیا اسباب کے بغیر
سیر و سفر پہ مجھ کو سفر نامہ لے گیا

گزرے گی ساری عمر ہی اب اِس ملال میں
سر کیوں نہ لے گیا ہے وہ عمّامہ لے گیا

کاشف حسین سوچنے والوں کے پر جلے
وہ جن بلندیوں پہ مجھے خامہ لے گیا

کاشف حسین وقت گزاری کے واسطے
”*میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا“

☆میرؔ

☆

لگائے بیٹھا تھا خلقِ خدا سے اُمیدیں
سو میرے ساتھ کِیا جو خدا نے ٹھیک کِیا
ہمارے شہر میں جو تیرگی کا باعث تھے
وہ سب چراغ بجھا کر ہوا نے ٹھیک کِیا

O

خواب آنکھوں کو پریشان بہت کرتے ہیں
یہ مری نیند کا نقصان بہت کرتے ہیں

روز آئینے سے ملتے ہیں نئے روپ کے ساتھ
آپ آئینے کو حیران بہت کرتے ہیں

باتیں کرتے ہیں بہت ویسے بھی یہ لوگ، مگر
میری خاموشی کے دوران بہت کرتے ہیں

میری اوقات مجھے بھولنے دیتے ہی نہیں
دوست مجھ پر مرے احسان بہت کرتے ہیں

خوش تو ہم رہ نہیں سکتے ہیں یہاں تیرے بغیر
ویسے خوش رہنے کا سامان بہت کرتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہیں موجود نہیں وہ غائرؔ
اپنے ہونے کا جو اعلان بہت کرتے ہیں

☆

میں چاہتا ہوں کہ اب تیرتا ہُوا دیکھے
کہ ڈوبتا تو سمندر نے مجھ کو دیکھ لیا

O

یہ جیون کا خلا بھر سا گیا ہے
وہ اب میرے لیے مر سا گیا ہے

کبھی اِس روپ میں دیکھا نہیں تھا
سو مجھ سے آئینہ ڈر سا گیا ہے

نہتّا شخص تھا وہ جس کے پیچھے
ابھی یہ لا و لشکر سا گیا ہے

ابھی دیکھا تھا اُس دریا کی جانب
کوئی پیاسا، سمندر سا گیا ہے

تھی اُس کے ذمے سیرابی ہماری
جو بادل تشنگی برسا گیا ہے

سکندر سا گیا کوئی جہاں سے
کوئی مردِ قلندر سا گیا ہے

وہ جھونکا تھا کوئی بادِ فنا کا
ابھی جو بادِصرصر سا گیا ہے

ہمارے ہاتھ سے یہ وقت غائرؔ
کسی جنگلی کبوتر سا گیا ہے

☆

آنے نہ پائے اُس کی ہنسی تک خیال میں
اب روئیے تو پوری توجہ سے روئیے

O

دل کو محرومِ رُخِ یار نہیں ہونے دیا
میں نے یہ آئنہ زنگار نہیں ہونے دیا

میری تعمیر کے اب عیب نہ گنوائیں مجھے
آپ نے ٹھیک سے مسمار نہیں ہونے دیا

ہائے کیا خواب تھا، وہ خواب کہ جس نے مجھ کو
عمر بھر نیند سے بیدار نہیں ہونے دیا

زندگی بھر ہی مرا کام بڑھائے رکھا
مجھ کو بیکاری نے بیکار نہیں ہونے دیا

غالباً سر کو جھکانے کی روش نے میری
سر مرا قابلِ دستار نہیں ہونے دیا

اُس مسیحا کی مسیحائی معمّا ٹھہری
جس نے مجھ کو کبھی بیمار نہیں ہونے دیا

میں اسی دل کا طرفدار ہوں غائرؔ جس نے
مجھ کو میرا ہی طرفدار نہیں ہونے دیا

☆

عشق میں دل کا یہ احوال بدلتا ہی نہیں
کیا پرندہ ہے پر و بال بدلتا ہی نہیں

O

فقط سفر ہی نہیں، ہمسفر بھی دیکھتے ہیں
کہ ہم اُدھر ہی نہیں اب اِدھر بھی دیکھتے ہیں

عجیب خواب ہے یہ وقت کے بدلنے کا
یہ خواب وہ ہے جو شام و سحر بھی دیکھتے ہیں

گزارتے چلے جاتے ہیں دن قفس میں مگر
ہم اس کے ساتھ ہی راہِ مفر بھی دیکھتے ہیں

شجر کو دیکھتے ہیں جس طرح مسافر سب
اسی طرح سے انھیں یہ شجر بھی دیکھتے ہیں

خدا نے اُس کو بنایا ہے کیسی مٹی سے
کہ آتے جاتے اسے کوزہ گر بھی دیکھتے ہیں

اس ایک خط کا فقط میں ہی منتظر نہیں ہوں
اب اس کی راہ کئی نامہ بر بھی دیکھتے ہیں

☆

کسی بھی کام کا رکھا نہ بے دلی نے مجھے
بہت خراب کِیا ہے تری کمی نے مجھے

☆

جو خاک نظر آتی ہے، وہ خاک نہیں ہے
لیکن ہمیں اِس بات کا ادراک نہیں ہے

O

کیوں نام لیا جائے کسی کا مرے آگے
اپنی ہی طلب کا ہے تماشا مرے آگے

کیا جانیے میں کون سی منزل کو رواں ہوں
بچھتا ہی چلا جاتا ہے رستہ مرے آگے

یہ وقت فقط میرے تصرّف کو بنا ہے
اِس وقت کی اوقات بھلا کیا مرے آگے

میں دیکھتا رہ جاتا ہوں اور صبح کا سورج
ہر روز ہی رکھ جاتا ہے کاسہ مرے آگے

خود اپنی بھی تقسیم پہ راضی ہوں میں لیکن
رکھ دیجیے پہلے مرا حصہ مرے آگے

اک عمر سے وہ شخص مرے دل کا مکیں ہے
کیا زیب اُسے دیتا ہے پردہ مرے آگے

احوال مرا پوچھنے آئے گا مگر پھر
لے بیٹھے گا وہ اپنا ہی قصہ مرے آگے

جاتا ہی نہیں ہے کسی صورت مرا بچپن
یہ چاند ابھی تک ہے کھلونا مرے آگے

روتا ہُوا اک شخص مسلسل مرے ہمراہ
ہنستا ہُوا اِک شہرِ تمنا مرے آگے

غائرؔ یہاں تقدیر کے لکھے کی طرح سے
آ سکتا ہے اک دن مرا لکھا مرے آگے

O

پہلے تقدیر کا نشانہ بنا
پھر میں تدبیر کا نشانہ بنا

لوگ مارے گئے ہیں عجلت میں
میں تو تاخیر کا نشانہ بنا

اور پھر ایک دن وہ تیر انداز
اپنے ہی تیر کا نشانہ بنا

میں بھی شمشیر سے ہوں کھیلا بہت
میں جو شمشیر کا نشانہ بنا

بچ گیا تھا جو انہدام سے کل
آج تعمیر کا نشانہ بنا

آندھیوں سے تو بچ گیا لیکن
پیڑ رہ گیر کا نشانہ بنا

کون آزاد ہوگیا غائرؔ
تُو جو زنجیر کا نشانہ بنا

☆

یوں تو ناکام ہوں، مگر غائرؔ
کام میں بیش تر کے آتا ہوں

O

پوچھتی آئی ہے بہار مرا
رنگ لایا ہے انتظار مرا

یہ کنایہ ہے گفتگو میری
اور خموشی ہے اِختصار مرا

آ گیا رزم گاہِ عشق میں کام
وہ جو اک دل تھا، جاں نثار مرا

دیکھتا ہے یوں روزنِ زنداں
جیسے ممکن نہ ہو فرار مرا

پھر بھی یہ کھیل کھیلتا ہوں میں
مسئلہ جیت ہے، نہ ہار مرا

پھر بھی اک بیکسی کا عالم ہے
شہر میرا ہے، شہریار مرا

خاک ہونے کی دیر تھی میرے
کہ ہوا لے اُڑی غبار مرا

☆

کیا اکیلی تُو بھٹکتی ہے، سسکتی ہے ہوا
آ مرے حلقۂ احباب میں شامل ہو جا

O

کچھ روز سے جو گھر میں بھی آرام وہ نہیں
ہم لوگ وہ نہیں کہ در و بام وہ نہیں

ممکن ہے ایک روز اِسے بھی میں چھوڑ دوں
جو کام کر رہا ہوں میں، یہ کام وہ نہیں

آغاز اسی طرح کا تھا، کردار بھی وہی
لیکن مری کہانی کا انجام وہ نہیں

سب کچھ بدل گیا ہے کسی کی نظر کے ساتھ
یہ صبح وہ نہیں ہے، مری شام وہ نہیں

بازار بھی جو جاؤ گے کیا لے کے آؤ گے
بھائی، کسی بھی چیز کے اب دام وہ نہیں

کاشفؔ حسین تیری خموشی گواہ ہے
جو آج اُس نے بھیجا ہے پیغام، وہ نہیں

☆

کچھ کام ہی نہیں ہے یہاں پارساؤں کا
آنا ہے اِس جگہ تو گنہگار ہو کے آ

O

مرے لیے وہ پریشان ہو کے آیا ہے
سو لطف بے سر و سامان ہو کے آیا ہے

عجب عدو ہے ہمارا کہ جو ہمارے لیے
کسی سے دست و گریبان ہو کے آیا ہے

زمیں کی تہہ سے، پہاڑوں سے، آسمانوں سے
کہاں کہاں سے یہ انسان ہو کے آیا ہے

میں کیا کروں کہ اُسی سمت جا رہا ہوں میں
جہاں سے نفع بھی نقصان ہو کے آیا ہے

عجب مقام ہے وہ رزم گاہِ حُسن، میاں!
اُدھر سے آیا جو قربان ہو کے آیا ہے

اس ایک شہرِ سخن ساز کا ہے کیا کہنا
گیا جو صاحبِ دیوان ہو کے آیا ہے

ہوائے شہر نے غائرؔ اُسے بکھیر دیا
جو شخص بھی یہاں یک جان ہو کے آیا ہے

☆

اب نظر آئینے میں آؤ مت
تم مرے راستے میں آؤ مت
یا مرے دائرے کو سمجھو تم
یا مرے دائرے میں آؤ مت

O

خواب ٹھہرا ہُوا جو دیدۂ نمناک میں ہے
گردشِ وقت ملانے کو اسے خاک میں ہے

کس طرح مٹّی کو بھی سونا بنا دیتا ہے
کوزہ گر تجھ میں ہے خوبی کہ ترے چاک میں ہے

اے اندھیروں کے پیمبر، اے زمیں کے مجرم
ایک سے ایک ستارہ تری پوشاک میں ہے

اِدھر آ اے سگِ دُنیا ترا کاسہ بھر دوں
اِتنی دولت تو ابھی دامنِ صد چاک میں ہے

آہٹیں اُس کی بھی میں زیرِ زمیں سنتا ہوں
"☆حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے"

مشورت کرنی ہے کچھ اس سے مگر کیا کیجے
عقل تو اُلجھی ہوئی وقت کے پیچاک میں ہے

کارِ دنیا کے تقاضے بھی عجب ہیں غائرؔ
دل سا معصوم بھی اب صحبتِ چالاک میں ہے

☆اقبالؔ

☆

تصویر بنا بیٹھا ہے جو رنج و الم کی
یہ آدمی وہ ہے جسے دُنیا کی طلب تھی

O

اب کوئی بھی کسی کے حق میں نہیں
یہ مکاں تک گلی کے حق میں نہیں

وہ مرے حق میں ہے، تعجب ہے!
جو ہوا، روشنی کے حق میں نہیں

زندگی سے ہے اختلاف بہت
میں مگر خودکشی کے حق میں نہیں

لاکھ گھڑیاں بدل لے، کیا ہوگا؟
وقت جب آدمی کے حق میں نہیں

ایسا لگتا ہے اب تو راستے بھی
میری آوارگی کے حق میں نہیں

جو تجھے بہترین کہتے ہیں
وہ تری بہتری کے حق میں نہیں

دشت کی بات اور ہے غائرؔ
شہر دیوانگی کے حق میں نہیں

☆

ممکن نہیں کہ سانپوں سے محفوظ رہ سکے
وہ آدمی کہ جس کو خزانے کا شوق ہے

O

یہ دیے آگ لگانے کے لیے رکھے ہیں
وہ الگ ہیں جو جلانے کے لیے رکھے ہیں

جو بھی اِس شہر میں آتا ہے، وہ جاتا ہی نہیں
کیونکہ دروازے ہی آنے کے لیے رکھے ہیں

تم سے ملتا ہوں اسی چہرے، اسی نام کے ساتھ
دوسرے میں نے زمانے کے لیے رکھے ہیں

گھر میں رکھے ہیں جو شمشیر و سنان و خنجر
صرف دشمن کو ڈرانے کے لیے رکھے ہیں

تم کو معلوم تو ہے ان کی حقیقت کیا ہے
جو بھی کردار فسانے کے لیے رکھے ہیں

بوجھ دفتر کا، مقدر کا، اکیلے پن کا
بوجھ کیا کیا مرے شانے کے لیے رکھے ہیں

ایک مدت سے جو آنکھوں میں پس انداز ہیں اشک
روح کی پیاس بجھانے کے لیے رکھے ہیں

اُن سے تصویریں بناتے ہیں ہمارے بچے
جو قلم لکھنے لکھانے کے لیے رکھے ہیں

ایسوں ویسوں سے فقط ہم نے مراسم غائرؔ
اپنے اِس گھر کو بچانے کے لیے رکھے ہیں

O

زمیں پہ میرے زمانے کے ختم ہوتے ہی
نہ جانے کیا ہو فسانے کے ختم ہوتے ہی

ہزار طرح کے سانپوں سے واسطہ تھا مرا
سکوں ملا ہے خزانے کے ختم ہوتے ہی

سب اپنا اپنا ہی چہرہ تلاش کرنے لگے
یہاں سے آئینہ خانے کے ختم ہوتے ہی

طرح طرح سے ہے تنقید کا نشانہ بنا
نشانے باز ، نشانے کے ختم ہوتے ہی

ازل سے دیکھ رہا ہوں یہ تاج و تخت کا کھیل
فلانا آیا، فلانے کے ختم ہوتے ہی

وہ برکتیں ہی زمانے سے اٹھ گئیں غائرؔ
زمیں پہ ایک گھرانے کے ختم ہوتے ہی

☆

میں پریشان ہوں کہ میرے لیے
وہ پریشان کچھ زیادہ ہے

O

ہوتے مجھے غرقاب کسی نے نہیں دیکھا
میرے سِوا یہ خواب کسی نے نہیں دیکھا

دیکھا یہ سبھی نے کہ میں بیتاب بہت ہوں
ہوں کس لیے بیتاب کسی نے نہیں دیکھا

جس نے بھی مجھے دیکھا ہے، دیکھا ہے سفر میں
لیکن مرا اسباب کسی نے نہیں دیکھا

سب کے لیے ہی سطح کی چیزوں میں کشش تھی
کیا کچھ تھا، تہِ آب کسی نے نہیں دیکھا

غائرؔ نظر آتا تو کوئی شور مچاتا
لگتا ہے کہ مہتاب کسی نے نہیں دیکھا

O

دل کے معاملات میں دانائی شرط ہے
کیا خواب دیکھنے کو بھی بینائی شرط ہے؟

ہیں پتھروں کے پاس بھی کیا کیا کہانیاں
لیکن بیان کے لیے گویائی شرط ہے

بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی کو خبر نہیں
اِس انجمن کے واسطے تنہائی شرط ہے

غائرؔ سمجھ میں آتے نہیں عشق کے اُصول
بکھراؤ شرط ہے، کہیں یکجائی شرط ہے

O

دُنیا کو دیکھنے سے سوا دیکھنا پڑا
اچھا ہے مجھ کو وقت بُرا دیکھنا پڑا

اشیا نئی تھیں اور پرانے تھے بام و در
آخر مجھے مکان نیا دیکھنا پڑا

معلوم ہی نہیں تھا جدائی ہے کیا بلا
اک دوسرے سے ہو کے جُدا دیکھنا پڑا

وہ لوگ جو کسی کا لکھا دیکھتے نہ تھے
تقدیر کا انھیں بھی لکھا دیکھنا پڑا

خود دیکھتے تو ہوتے نہ اتنے گناہ گار
جو تیرے دیکھنے پہ ذرا دیکھنا پڑا

غائرؔ یہ زندگی کا تماشا عجیب ہے
دیکھا جو ایک بار سدا دیکھنا پڑا

☆

رواں جو تیری طرف شام ہے ہماری طرح
اسے بھی تجھ سے کوئی کام ہے ہماری طرح

O

ہونے کا یہ گمان ابھی ہے، ابھی نہیں
میرے لیے جہان ابھی ہے ابھی نہیں

اک کھیل چل رہا ہے چراغ اور ہوا کے بیچ
روشن مرا مکان ابھی ہے،ابھی نہیں

تکیہ کیے ہوئے ہوں میں جس مہربان پر
وہ بھی تو مہربان ابھی ہے،ابھی نہیں

سب کچھ گنوا کے مجھ کو بڑا اِطمنان ہے
لیکن یہ اِطمنان ابھی ہے، ابھی نہیں

اُس گھر میں کیا کسی سے مدارات کا گلہ
جس گھر کا میزبان ابھی ہے، ابھی نہیں

دنیا تو اک سرائے ہے اور اس سرائے میں
انسان میہمان ابھی ہے، ابھی نہیں

کیسا زمین زاد ہوں کاشفؔ حسین میں
خوش جس سے آسمان ابھی ہے، ابھی نہیں

☆

میں اپنے آپ کو جب ڈوبتا دکھائی دیا
پھر اس کے بعد تو سب ڈوبتا دکھائی دیا

O

ہمارے سامنے دنیا کا حال رکھا ہے
سو ایک عمر سے خود کو سنبھال رکھا ہے

یہ آدمی کو خدا سے قریب کرتی ہیں
مصیبتوں میں عجب یہ کمال رکھا ہے

لرز رہی ہے دیے کو جواب دیتے ہوئے
ہوا کے سامنے کیسا سوال رکھا ہے

اسی لیے تو میں جاتا نہیں کسی کے خلاف
یہ راستہ بھی بہت دیکھ بھال رکھا ہے

گزر رہے ہیں جسے پائمال کرتے ہوئے
اسی زمیں نے ہمیں پائمال رکھا ہے

مگر جواب نہیں اپنی بے خیالی کا
کسی نے حد سے زیادہ خیال رکھا ہے

☆

اکثر اوقات یوں مڑ مڑ کے اسے دیکھتا ہوں
جیسے دنیا بھی مرا نقشِ قدم ہے کوئی
کون کہتا ہے کہ یہ کارِ محبت ہے فضول
اِس سے بڑھ کے بھی یہاں کارِ اہم ہے کوئی

O

خزاں تو مجھ پہ طاری ہو رہی ہے
دُکھی بادِ بہاری ہو رہی ہے

یہ آدھا شہر خالی ہوگیا ہے
عجب مردم شماری ہو رہی ہے

بس اٹھنے دو مجھے اب، بیٹھے بیٹھے
مری زنجیر بھاری ہو رہی ہے

جسے دیکھو وہی سویا ہوا ہے
یہ اچھی شب گزاری ہو رہی ہے

پرانی خواہشوں کا کیا بنے گا
"☆نئی فہرست جاری ہو رہی ہے"

☆جمال احسانی

O

اک ساعتِ فانی نے مری نیند اُڑا دی
دنیا کی کہانی نے مری نیند اُڑا دی

وہ مصرعۂ اولیٰ تو چلو خواب میں لکھا
اس مصرعۂ ثانی نے مری نیند اُڑا دی

بچپن کی شرارت سے ابھی آنکھ لگی تھی
اور آ کے جوانی نے مری نیند اُڑا دی

میں خواب میں بنتا ہُوا گھر دیکھ رہا تھا
پھر نقلِ مکانی نے مری نیند اُڑا دی

غائرؔ میں کہاں جاگتا تھا رات گئے تک
اک یاد پرانی نے مری نیند اُڑا دی

O

کچھ اور بے سروسامانی بڑھ گئی میری
میں خوش ہُوا تو پریشانی بڑھ گئی میری

عجیب بات تھی جو مجھ سے خالی گھر نے کہی
تمھارے آنے سے ویرانی بڑھ گئی میری

ذرا سی دیر میں آئینہ اُس نے توڑ دیا
ذرا سی دیر میں حیرانی بڑھ گئی میری

لباس پہنا تھا میں نے بدن چھپانے کو
مگر یہ کیا ہُوا عریانی بڑھ گئی میری

تجھے خبر ہے یوں تیرے معاف کرنے سے
میں خوش نہیں ہوں، پشیمانی بڑھ گئی میری

تُو سامنے ہے مرے پھر بھی مجھ کو دھیان نہیں
کچھ آج اِتنی یہ بے دھیانی بڑھ گئی میری

ادھر فرار کا سوچا ہے اور ادھر غائرؔ
میں دیکھتا ہوں کہ نگرانی بڑھ گئی میری

☆

بڑھا رہی ہے مری مشکلیں جو روز بہ روز
پتا نہیں مجھے تقدیر کیا سمجھتی ہے؟
اڑا رہی ہے جو دیوارِ خستگی کا مذاق
یہ خود کو آپ کی تصویر کیا سمجھتی ہے؟

O

دل کہ بازارِ جاں سے اُٹھتا ہے
کیسا گاہک دکاں سے اُٹھتا ہے

سُن رہا ہوں مری خموشی کا
شور کون و مکاں سے اُٹھتا ہے

چھوڑ جاتی ہے زرد پھولوں کو
بوجھ یہ کب خزاں سے اُٹھتا ہے

بزمِ غم، محفلِ طرب تو نہیں
کب کوئی درمیاں سے اُٹھتا ہے

آئے دن رفتگاں سے ملنے کو
کوئی آئندگاں سے اُٹھتا ہے

خلوتِ دشمناں کی خاطر تُو
محفلِ دوستاں سے اُٹھتا ہے

میں تو اُٹھ آیا ہوں وہاں سے، اب
دیکھو دل کب وہاں سے اُٹھتا ہے

رنج تو یہ ہے اب مرا کردار
وقت کی داستاں سے اُٹھتا ہے

غائرؔ اب پیڑ کا خدا حافظ!
یہ مسافر یہاں سے اُٹھتا ہے

O

وہ خود سے برسرِ پیکار ہے ہمارے لیے
یہ بات باعثِ آزار ہے ہمارے لیے

ہمارے بس میں نہیں ہے ہمارا کام کوئی
ہمارا سوچنا بیکار ہے ہمارے لیے

چلو، چراغ سہی، کوئی آدمی نہ سہی
کوئی تو رات کو بیدار ہے ہمارے لیے

صدائیں دے کے بھی دیکھا ہے اور دستک بھی
ہر ایک در یہاں دیوار ہے ہمارے لیے

جواب دیتے ہیں ہر بات کا خموشی سے
یہی تو صورتِ اظہار ہے ہمارے لیے

کہیں خریدا ہے خود کو کہیں پہ بیچا ہے
یہ شہر کچھ نہیں، بازار ہے ہمارے لیے

اُبھرتے دیکھ رہے ہیں اک آفتاب کو ہم
یہ رات تو سحر آثار ہے ہمارے لیے

☆

کارِ دنیا میں کشش ایسی تھی
ورنہ کب دل کی روش ایسی تھی

O

موت کے اِس کھیل میں گر زندگی شامل نہ ہو
پھر کسی قیمت پہ اِس میں آدمی شامل نہ ہو

اپنے ہونے کا مجھے بھی لطف اُٹھانے دے ذرا
میرے ہونے میں کسی صورت ابھی شامل نہ ہو

آرزو پوری نہ ہو تو دل بُرا مت کیجیے
وقت کے چکر میں شاید یہ گھڑی شامل نہ ہو

قصہ گو نے چھیڑ دی ہے پھر کہانی دیو کی
ننھے بچوں کی دعا ہے اب پری شامل نہ ہو

کینوس پر ایسا اک منظر بنانا ہے مجھے
رنگ تو شامل ہوں جس میں روشنی شامل نہ ہو

گو تصوّر میں سہی اُس در پہ میں پہنچا تو ہوں
کیسے ممکن ہے کہ میری حاضری شامل نہ ہو

دیکھ اِس نام آوری کی دوڑ میں کاشف حسین
کل بھی تُو شامل نہیں تھا، آج بھی شامل نہ ہو!

☆

قفس میں رہنے والے ان گرفتاروں سے کیا کہتا
مسیحا تھا میں اپنا حال بیماروں سے کیا کہتا

O

میرے آگے تھے مال و اسباب چُنے
لیکن میں نے خوشبو سے احباب چُنے

مجبوری ہے ہم ایسے معماروں کی
کون وگرنہ دیواروں میں خواب چُنے

خاک سے اچھی تو کوئی پوشاک نہیں
لیکن ہم نے اطلس اور کمخواب چُنے

اب تو سب ہی مرنے پر آمادہ ہیں
اِس بستی کو شوق سے اب سیلاب چُنے

موت کسی کو مہلت ہی کب دیتی ہے
کیا کوئی اپنا بکھرا اسباب چُنے

کاشف غائرؔ اب تہ میں لے جانے کو
سطح سے دیکھو کس کو یہ گرداب چُنے

☆

خلاف اک دوسرے کے ہیں یہ ناصح
شرابی تو شرابی کی طرف ہے

O

دل ہے کہ بہ ضد نجم شماری کے لیے ہے
یہ رات مگر گریہ و زاری کے لیے ہے

چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہیں یہاں خود دار
یہ شہرِ سخی صرف بھکاری کے لیے ہے

آدھی سے زیادہ وہ زمیں چھین چکے ہیں
لگتا ہے کہ یہ جنگ تو ساری کے لیے ہے

اے بادِ خزاں دیکھ ذرا دل کی طرف بھی
یہ پھول تری نذر گزاری کے لیے ہے

اب آئی ہے اِس دشت میں تو خاک اُڑائے
کیا کام یہاں بادِ بہاری کے لیے ہے

اب چھوڑ بھی دو خاک پہ تصویر بنانا
یہ خاک کہاں نقش نگاری کے لیے ہے

ہے عجز کی دستار مری طبع کو مرغوب
یہ رخشِ انا صرف سواری کے لیے ہے

غائرؔ وہ کتابیں ہوں کہ باتیں ہوں کہ یادیں
ہر چیز یہاں وقت گزاری کے لیے ہے

☆

دونوں سمجھ رہے تھے کوئی بات ہوگئی
اچھا ہُوا جو آج ملاقات ہوگئی

O

سوال کچھ ہے مرا، کچھ جواب ملتا ہے
کسی کے خواب سے کب میرا خواب ملتا ہے

بِتا کے دیکھ چکا ہوں میں دن سمندر میں
قدم قدم پہ یہاں بھی سراب ملتا ہے

کچھ اِس قدر ہے یہاں آب کی فراوانی
کہ ہر مکان یہاں زیرِ آب ملتا ہے

چھپائے چھپتا نہیں ہے یہ رنجِ ناکامی
کبھی جو مجھ سے کوئی کام یاب ملتا ہے

کہاں کا سیر و سفر میں تو تنگ آ گیا ہوں
جدھر بھی جایئے، موسم خراب ملتا ہے

کہیں ملے جو خوشی تو خرید لیتا ہوں
کہ رنج و غم تو یہاں بے حساب ملتا ہے

نمازِ عشق و محبت عجیب ہے غائرؔ
قضا بھی پڑھیے تو پورا ثواب ملتا ہے

☆

ایسی تو اب طویل نہ ہوتی شبِ فراق
اک بات مان لیتے ستارے اگر مری
کاشف حسین شوقِ اسیری کی خیر ہو
پڑنے لگی ہے روشنی زنجیر پر مری

O

خوش نظر آتا ہوں خوشی کے بغیر
ہنسنا پڑتا ہے اب ہنسی کے بغیر

دل کی آنکھوں سے کام لیتا ہوں
دیکھتا ہوں میں روشنی کے بغیر

یہی خوبی ہے میرے دوستوں کی
رہ نہیں سکتے دشمنی کے بغیر

آپ ہی میرے ساتھ رہتے ہیں
اور میں رہتا ہوں آپ ہی کے بغیر

کیا عجب شہر ہے یہاں غائرؔ
آدمی خوش ہے آدمی کے بغیر

O

عجلت کے باب میں مجھے تاخیر کیا ہوئی
مسمار ہوگیا ہوں میں، تعمیر کیا ہوئی

ویسے میں زندگی کا گرفتار اب بھی ہوں
لیکن وہ میرے پاؤں کی زنجیر کیا ہوئی؟

لگنے لگی ہے رات پُر اسرار سی مجھے
دیوار و در کی خامشی گمبھیر کیا ہوئی

یہ وقت میری سوچ سے آگے نکل گیا
مجھ سے بس ایک لمحے کی تاخیر کیا ہوئی

زندہ کیوں آ رہے ہیں سبھی رزم گاہ سے
کاشفؔ حسین، سنتِ شبیرؓ کیا ہوئی؟

O

بے گھروں کے واسطے کوئی مکاں خالی نہیں
یہ زمیں خالی نہیں، وہ آسماں خالی نہیں

آنے ہی والا ہے وہ جس نے ٹھہرنا ہے یہاں
دل جو خالی ہے ابھی تک رایگاں خالی نہیں

کیا گلی سے پھر گزرنے کو ہے کوئی قافلہ
سارے دروازے بھرے ہیں، کھڑکیاں خالی نہیں!

بھر چکا ہے آج انسانوں کا انسانوں سے دل
ورنہ تو یہ بستیاں، یہ وادیاں خالی نہیں

رایگانی کے سِوا ملتا نہیں ہے کچھ یہاں
پھر بھی اِس بازار میں کوئی دُکاں خالی نہیں

زخمِ دل تازہ ہُوا، یہ جا کے اندازہ ہُوا
دُشمنوں سے کوئی بزمِ دوستاں خالی نہیں

دیکھ لو، کیسے بھرے بیٹھے ہیں تیر انداز سب
اے پرندو ہوشیار، اک بھی کماں خالی نہیں

آب ودانے سے،خزانے سے وہ بھر دے گا مجھے
ذکر سے جس کے یہ دل اور یہ زباں خالی نہیں

سُن رہے ہیں شوق سے سب قصۂ اہلِ جنوں
شُکر ہے غائرؔ صفِ آئندگاں خالی نہیں

(امّی کے لیے)

دھوپ میں رختِ سفر ایک دعا کا سایہ
کچھ نہیں پاس مگر ایک دعا کا سایہ

یا سرِ راہ گزر میں ہوں اندھیرے میں رواں
یا سرِ راہ گزر ایک دعا کا سایہ

پیڑ بھی حیرت و حسرت سے مجھے دیکھتے ہیں
ماں کی خدمت کا ثمر ایک دعا کا سایہ

کس طرح آئے مرے دل میں بھٹکنے کا خیال
ساتھ ہے مثلِ خضر ایک دعا کا سایہ

طے نہ ہوتی کبھی صحرا کی مسافت مجھ سے
سر پہ ہوتا نہ اگر ایک دعا کا سایہ

گردشِ وقت کو لاتا ہی نہیں خاطر میں
ہے مرے پیشِ نظر ایک دعا کا سایہ

ٹکڑے ٹکڑے ہوئی شمشیر مصائب غائرؔ
بن گیا میری سِپر ایک دعا کا سایہ

☆

ورنہ یوں جاگنا آسان نہیں تھا غائرؔ
اِن ستاروں نے مری حوصلہ افزائی کی

O

راستے خوف و خطر والے ہیں
ورنہ دن سیر و سفر والے ہیں

جانتے ہیں در و دیوار کا دُکھ
ہم جو دیوار نہ در والے ہیں

دل کے گرداب میں آئے تو کُھلا
اِس کے چکر بھی بھنور والے ہیں

پر کٹے ہیں سو مری کیا پرواز
آپ تو اُڑیے کہ پر والے ہیں

حاکمِ شہر بنے بیٹھے ہو
کام تو شہر بدر والے ہیں

جو نظر آ رہے ہیں بے دستار
ہاں یہی لوگ تو سر والے ہیں

میرؔ صاحب نے بتایا ہے ہمیں
عیب والے بھی ہنر والے ہیں

اِس بیابان میں خوش رہتا ہوں
سارے منظر وہی گھر والے ہیں

غائرؔ اندھا بھی کوئی کیا ہو گا
جتنے اندھے یہ نظر والے ہیں

O

یہ محبت کا چلن عام نہیں تھا پہلے
اِن درختوں پہ کوئی نام نہیں تھا پہلے

شام ہوتے ہی اُتر آتے تھے آنگن میں مرے
اِن ستاروں کو کوئی کام نہیں تھا پہلے

میں نے بارِ دگر آغاز کِیا جینے کا
میرے پیشِ نظر انجام نہیں تھا پہلے

میری ہی دھوپ مرے ساتھ رہا کرتی تھی
سایۂ گردشِ ایّام نہیں تھا پہلے

تم بھی دنیا کی طرح مصلحت اندیش نہ تھے
میری باتوں میں بھی ابہام نہیں تھا پہلے

لوگ اِس راہ پہ تا عمر چلا کرتے تھے
یہ سفر عشق کا دو گام نہیں تھا پہلے

جانے کیا سوچ کے اب دھوپ میں خوش رہتا ہے
جس کو سائے میں بھی آرام نہیں تھا پہلے

پہلے ہر نام پہ چونک اُٹھتا تھا کاشف غائرؔ
غالباً میرا کوئی نام نہیں تھا پہلے

O

خود آپ اپنی مدح سرائی میں پڑ گیا
کیا اچھا آدمی تھا، بُرائی میں پڑ گیا

کیا نازُکی تھی اُس کی کہ چُھوتے ہی پھول کو
اک آبلہ سا دستِ حنائی میں پڑ گیا

میری طرح سے تُو بھی اسیری کا لُطف لے
بیکار میں ہی فکرِ رہائی میں پڑ گیا

نمرود کو جہان میں کوئی کمی نہ تھی
لیکن وہ شخص خبطِ خدائی میں پڑ گیا

کب تک بھلا ٹھٹھرتا ہُوا دیکھتا اُسے
چپ چاپ آ کے میں تو رضائی میں پڑ گیا

دُنیا میں ایک دل ہی ہمارا وکیل تھا
کم بخت وہ بھی صلح صفائی میں پڑ گیا

اِس شہر میں یہی تو منافع کا کام ہے
یونہی نہیں وہ کارِ گدائی میں پڑ گیا

☆

نظارے کی طرح بکھرا ہوا ہوں
نظر مجھ کو اِکھٹا کر رہی ہے
ضروری تو نہیں دنیا میں غائرؔ
وہی کیجے جو دنیا کر رہی ہے

O

سر پہ وہ عالمِ افلاک اُٹھا لیتا ہے
جو بھی کوچے کی ترے خاک اُٹھا لیتا ہے

عشق نقصان کا سودا ہے سراسر، لیکن
فائدہ اِس سے بھی چالاک اُٹھا لیتا ہے

تہمتِ سنگ دلی ہم سے نہیں ہے اُٹھتی
جانے کیسے دلِ سفّاک اُٹھا لیتا ہے

جانے کس سوچ میں ہے صبح سے یہ کوزہ گر
چاک رکھتا ہے کبھی چاک اُٹھا لیتا ہے

سونا چاندی سے بھی منہ پھیر کے گزرے کوئی
کوئی بڑھ کر خس و خاشاک اُٹھا لیتا ہے

O

زمیں کی بات پہ ہم نے تو دھیان تک نہ دیا
کہ فصل کاٹی گئی اور لگان تک نہ دیا

یہ شہر کرکے ہمارے ہی نام پر آباد
ہمیں ہی رہنے کو اِس میں مکان تک نہ دیا

جو ہم سفر تھے مجھے راستے میں چھوڑ گئے
کسی نے ساتھ مرا آسمان تک نہ دیا

ہمارے واسطے وہ لوگ جان کیا دیتے
ہمارے حق میں کسی نے بیان تک نہ دیا

نہ جانے پوچھ لے کیا ہم سے ممتحن غائرؔ
اِس ایک ڈر سے کبھی امتحان تک نہ دیا

O

باہر چمک رہی ہے جو اندر کی دھوپ ہے
کتنی عجیب میرے مقدر کی دھوپ ہے

دونوں طرف ازل سے ہے یکساں کھلی ہوئی
جانے یہ دھوپ کون سے منظر کی دھوپ ہے

بیٹھا ہُوا ہوں میں کہ یہ سایہ کسے نصیب
بیٹھا ہُوا ہوں میں کہ ترے در کی دھوپ ہے

لوگوں نے آفتاب بھی تقسیم کر لیا
اب آدھی دشت، آدھی سمندر کی دھوپ ہے

غائرؔ سوائے صبر کے چارہ کوئی نہیں
سایہ بھی کیا کرے کہ برابر کی دھوپ ہے

O

خشک اب دیدۂ پرنم نہیں ہونے والا
وقت کے ساتھ یہ دکھ کم نہیں ہونے والا

میں ترا سوگ مناؤں گا یونہی خلوت میں
کہ دکھاوے کا تو ماتم نہیں ہونے والا

تیری تحریریں ہیں یا بولتی تصویریں ہیں
اوجھل آنکھوں سے یہ البم نہیں ہونے والا

ایسا بکھرا ہے یہ گلدستۂ احباب ترا
اب ترے بعد منظّم نہیں ہونے والا

غائرؔ اِس شہر میں کوئی بھی نہیں اُس جیسا
یعنی اب دل یہ کہیں خم نہیں ہونے والا

(برادرم آصف فرخی کے انتقال پر)

O

مجھے جو دیکھ نہیں سکتے نام کرتے ہوئے
گزر رہا ہوں انھیں بھی سلام کرتے ہوئے

یہ آرزو ہے انھیں بولتا ہُوا دیکھوں
کہ کیسے لگتے ہیں پتھر کلام کرتے ہوئے

اس احتیاط کو ہی انہماک کہتے ہیں
تمھارا دھیان تک آیا نہ کام کرتے ہوئے

اُدھر وہ آنے نہ آنے کی کشمکش میں ہے
گزر رہی ہے اِدھر اہتمام کرتے ہوئے

O

کام ہمارے دیوار و در آ جاتے ہیں
اسی لیے بے کاری میں گھر آ جاتے ہیں

اِس مہتابِ دل کا پُرسہ دینے مجھ کو
کتنے تارے روز ہی چھت پر آ جاتے ہیں

اس رستے میں شرط ہے چلتے ہی رہنا کیا؟
رُکنے کا سوچوں تو چکّر آ جاتے ہیں

اس دن مجھ کو رزق زیادہ مل جاتا ہے
جس دن کچھ مہمان مرے گھر آ جاتے ہیں

پھر ان کو یہ دھوپ بُری لگنے لگتی ہے
جن لوگوں کو سائے میسر آ جاتے ہیں

کچھ دن سے وہ حال ہے کچھ معلوم نہیں ہم
کب گھر جاتے ہیں کب دفتر آ جاتے ہیں

اِس بستی میں کوئی سخی بھی آئے خداوند
دن چڑھتا ہے اور گداگر آ جاتے ہیں

صبر و قناعت ہے اک ایسا پیالہ جس میں
تشنہ کامو ! سات سمندر آ جاتے ہیں

کاشف غائرؔ میری کہانی سننے اکثر
قصّہ گو چوپال سے اُٹھ کر آ جاتے ہیں

O

باہر کبھی اندر کی کوئی بات نہیں کی
دروازے سے بھی گھر کی کوئی بات نہیں کی

ملحوظ رکھا میں نے ان آنکھوں کی نمی کو
صحرا میں سمندر کی کوئی بات نہیں کی

ہارا تو وہ روتا رہا تقدیر کا رونا
جیتا تو مقدر کی کوئی بات نہیں کی

اُس آنکھ نے پت جھڑ کا کوئی ذکر نہ چھیڑا
دل نے بھی گلِ تر کی کوئی بات نہیں کی

گھر میں بھی رہا گھر کے مسائل سے گریزاں
دفتر میں بھی دفتر کی کوئی بات نہیں کی

خوابوں کی کہانی نے مری نیند اُڑا دی
پھر تکیہ و چادر کی کوئی بات نہیں کی

اب عشق میں کچھ کام نہیں نامہ بروں کا
سو میں نے کبوتر کی کوئی بات نہیں کی

☆

زندگی بے سایگی کا نام ہے
اور مرے جاتے ہیں ہم چھت کے لیے

O

پڑی اس آنکھ کی جب روشنی ستارے پر
تو پھر شروع ہوئی زندگی ستارے پر

مرا چراغ ہوا نے بجھا دیا، ورنہ
میں خود کو دیکھ رہا تھا کسی ستارے پر

میں سوچتا ہوں ستارے کا حال کیا ہوگا؟
پہنچ گیا جو کبھی آدمی ستارے پر

یہ رات اب جسے تسخیر کرنا چاہتی ہے
مری نظر ہے اسی آخری ستارے پر

سیاہ رات کا چہرہ اُتر گیا غائرؔ
کہ اک چراغ نے کیا بات کی ستارے پر

O

دریا کی سمت، دل کے اِشارے پہ آ کے ہم
بیٹھے ہوئے ہیں کب سے کنارے پہ آ کے ہم

اب جنگلوں میں آگ کہاں دستیاب ہے
تاپے ہیں ہاتھ دل کے شرارے پہ آ کے ہم

یہ لفظ بولتے ہی زباں لڑکھڑا گئی
سو رُک گئے ہیں لفظ "سہارے" پہ آ کے ہم

کاشفؔ حسین اپنی زمیں سے نہیں بنی
آباد ہو گئے ہیں ستارے پہ آ کے ہم

O

شدید حبس ہے اِس شہر میں ہوا کی قسم
تمھیں سجھائی نہیں دے رہا؟ خدا کی قسم!

مری کہانی پہ کیسے یقین آئے گا؟
بتاؤ مِنٹو کی کھاؤں یا کافکا کی قسم

ہر ایک سانپ کا میں سر کُچل کے رکھ دوں گا
جو میری راہ میں حائل ہوئے عصا کی قسم

غمِ حسینؑ نے دُنیا سے بے نیاز کِیا
بڑے مزے میں گزرتی ہے کربلا کی قسم!

میں ابتدا ہی میں ہوش و حواس کھو بیٹھا
کِیا ہے عشق نے وہ حال، انتہا کی قسم

سفر میں ذرہ برابر نہ فرق آئے گا
زمانہ کچھ بھی کہے تیری خاکِ پا کی قسم

یہ قاتلوں کو مسیحا سمجھنے لگتے ہیں
ہمارے لوگ بھی کیا لوگ ہیں، خدا کی قسم!

یہ اور بات میں تم کو معاف کر بھی چکا
یہ زخم بھرتا نہیں ہے مگر خلا کی قسم

سوائے عشق ہے ہر چیز کو فنا غائرؔ
یہاں تلک کہ فنا کو بھی ہے، فنا کی قسم!

O

ٹھہراؤ اِس ندی کا روانی سے کم نہیں
پیاسوں کا ڈوبنا بھی کہانی سے کم نہیں

بدلے نہ خدّوخال بھی احوال کی طرح
تصویر یہ نئی بھی پُرانی سے کم نہیں

اس سرزمینِ دل پہ حکومت عدو کی ہے
یہ رنج مجھ کو نقل مکانی سے کم نہیں

جو اِس کی زد پہ آیا، وہی راکھ ہو گیا
یہ خامشی بھی شعلہ بیانی سے کم نہیں

کچھ دُور ساتھ چلنے سے اندازہ ہو گیا
اُس کی یہ نازکی بھی گرانی سے کم نہیں

وہ آدمی کہ طاق مُکرنے کے فن میں ہے
لکّھا ہُوا بھی اُس کا زبانی سے کم نہیں

کاشفؔ حُسین جس کو ہو نسبت حُسینؑ سے
اُس کے لیے تو پیاس بھی پانی سے کم نہیں

☆

کارِ دنیا پہ بہت غور کِیا
ہم نے یونہی نہیں کچھ اور کِیا

O

کیسے ہو میری اور تری تنہائی ایک سی
بِکھراؤ ایک سا ہے، نہ یکجائی ایک سی

کوہِ انا سے دیکھ رہا تھا جہان کو
ہر چیز اس جگہ سے نظر آئی ایک سی

یہ فرق دیکھنے کا نہیں، سوچنے کا ہے
ورنہ ہے میری آپ کی بینائی ایک سی

اک شخص جی اٹھا ہے تو اک شخص مر گیا
حالانکہ ہو رہی تھی مسیحائی ایک سی

دیوانگی میں جرم کیے تھے الگ الگ
لیکن دماغ و دل نے سزا پائی ایک سی

غائرؔ وہ میرا شعر ہو یا زخم ہو کوئی
دونوں میں چاہتا ہوں میں گہرائی ایک سی

☆

مار ڈالوں گا اسے میں غائرؔ
اِس سے پہلے کہ مجھے ڈر مارے

☆

وہ ہے مصروف جہاں بانی میں
اور میں اپنی پریشانی میں

O

سمجھا کہاں گیا اُسے مانا کہاں گیا
اب سوچنا ہی کیا کہ دوانہ کہاں گیا

جنگل کے راز ان کے سِوا جانتا ہے کون
سانپوں سے پوچھیے کہ خزانہ کہاں گیا؟

کیا آدمی ہے اپنا زمانہ گزار کر
اب پوچھتا ہے میرا زمانہ کہاں گیا؟

تھے جتنے جیتے جاگتے وہ عکس کیا ہوئے
یہ راتوں رات آئنہ خانہ کہاں گیا

کوئی پرندگاں سے بھی کرتا ہے دشمنی؟
حیرت میں ہوں کہ ان کا ٹھکانہ کہاں گیا

ماتم بھی ہوگا، گریہ و زاری بھی شہر میں
اُس تک ابھی ہمارا فسانہ کہاں گیا

دل کی طرف رواں تھا وہ پہنچا جو تیری سمت
دنیا کی سمت تھا جو روانہ کہاں گیا؟

رہ رہ کے پوچھتا ہے دل اک ایک دوست کو
غائرؔ فُلاں کہاں ہے؟ فُلانہ کہاں گیا؟

کاشف حسین غائرؔ اسی شہرِ خواب میں
وہ گھر تو آج بھی ہے، گھرانہ کہاں گیا؟

O

ہوا کی باتوں میں آیا ہُوا پرندہ ہے
غبار ہے کہ سدھایا ہُوا پرندہ ہے

عجب نہیں کہ کسی روز یہ بھی اُڑ جائے
جو کینوس پہ بنایا ہُوا پرندہ ہے

بجھا بجھا سا جو یہ نقش ہے سرِ منظر
بنا بنا کے مٹایا ہُوا پرندہ ہے

جو آدمی نظر آتا ہے، آدمی تو نہیں
شکاریوں کا ستایا ہُوا پرندہ ہے

عجیب کھیل سا رہتا ہے دھوپ چھاؤں کا
یہ ابر کس کا اُڑایا ہُوا پرندہ ہے

میں اپنی قید میں ہوں اور اِن دنوں غائرؔ
مرے حواس پہ چھایا ہُوا پرندہ ہے

☆

کبھی اِن کا مطالعہ کیجے
اب تو یہ دُکھ کتاب ہوگئے ہیں

O

بزم آرائی کسی اور طرف لے جائے
اور یہ تنہائی کسی اور طرف لے جائے

بند آنکھوں سے تری سمت سفر کرتا ہوں
ورنہ بینائی کسی اور طرف لے جائے

عین ممکن ہے کہ اِس راہ میں بیٹھے ہوؤں کو
آبلہ پائی کسی اور طرف لے جائے

روک رکھا ہے اسے بس مری نادانی نے
ورنہ دانائی کسی اور طرف لے جائے

دل کو لے جاؤ کہیں اور کہ اِس سے پہلے
یہ تمھیں بھائی، کسی اور طرف لے جائے

میری اوقات مرے پیشِ نظر ہے، ورنہ
یہ پذیرائی کسی اور طرف لے جائے

میں وہ دیوانہ نہیں ہوں جسے کاشف غائرؔ
دشت پیمائی کسی اور طرف لے جائے

☆

مسافر تھک سا جاتا ہے جو منزل سامنے آئے
کنارے پر پہنچ کر زورِ دریا ٹوٹ جاتا ہے

O

دولتِ آبلہ پائی بھی گئی
بیٹھے بیٹھے یہ کمائی بھی گئی

کب تلک ساتھ نبھاتی میرا
ایک دن شامِ جدائی بھی گئی

نہ چھوئی میں نے شرابِ دنیا
گو مرے سامنے لائی بھی گئی

میں نے پھر بھی نہ اُسے پہچانا
خواب میں شکل دکھائی بھی گئی

دونوں ہی حالتیں گزریں مجھ پر
عمر بیتی بھی، بِتائی بھی گئی

مجھ کو تنقید سے کیا فرق پڑا
یہ گھٹائی بھی بڑھائی بھی گئی

آڑے آنے نہ دی رشتوں میں انا
بات بگڑی تو بنائی بھی گئی

☆

سبھی بینا و نابینا میں غائرؔ
انھی آنکھوں کا چرچا ہو رہا ہے

○

یہ زخم پیٹھ کا سینے پہ ہونا چاہیے تھا
تو فخر آپ کو جینے پہ ہونا چاہیے تھا

ہم اس سفر کے لیے ایک ساتھ نکلے تھے
تمھیں تو آخری زینے پہ ہونا چاہیے تھا

یہ کون لوگ ہیں نقشے پہ ہی جھگڑنے لگے
تنازعہ تو خزینے پہ ہونا چاہیے تھا

وہ کس خیال سے دریا کی سیر کو نکلے
بھروسا کچھ تو سفینے پہ ہونا چاہیے تھا

ہُوا تھا کھیل کا آغاز خون سے غائرؔ
تو اختتام پسینے پہ ہونا چاہیے تھا

○

گھر کا مفہوم سمجھ در بدری میں آیا
کیا ہنر تھا جو مجھے بے ہنری میں آیا

دیکھا اک روز جو افلاک کو گردش کرتے
پھر مجھے لطف کہاں کوزہ گری میں آیا

اب جو دن رات اکیلا میں سفر کرتا ہوں
یہ ہنر مجھ کو تری ہمسفری میں آیا

دُور و نزدیک یہاں کوئی نہیں میرے ساتھ
مجھ کو اِتنا تو نظر کم نظری میں آیا

ہوش مندوں کو کہاں دل سے علاقہ غائرؔ
جو بھی آیا ہے یہاں بے خبری میں آیا

O

یہ معجزہ بھی ہُوا ہے، دُعا کے آخری دن
پلٹ گیا مرے نزدیک آ کے آخری دن

وہ پہلے دن سے ہی منزل کے انتظار میں تھا
کہ موج لے گئی جس کو بہا کے آخری دن

تمام عمر کی میں بے رُخی کو بھول گیا
ملا جو مجھ سے کوئی مُسکرا کے آخری دن

یہ ایک بات اُسے خط میں کس طرح لکھتا
کہ کتنا رویا تھا اُس کو ہنسا کے آخری دن

ہے پیش لفظ کتابِ اجل کا خوابِ حیات
کُھلا یہ بھید جہاں میں بِتا کے آخری دن

کئی دنوں سے وہ اٹکھیلیاں نہیں کرتی
چمن میں جیسے ہوں بادِ صبا کے آخری دن

میں بے قصور تھا غائرؔ یہ بات منصف کو
پتا چلی بھی تو میری سزا کے آخری دن